طب اور اس سے متعلق بعض جدید فقہی مسائل

مولانا محمد ظفر عالم ندوی
استاذ حدیث وفقہ دار العلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

دورِ حاضر میں میڈیکل سائنس کی غیر معمولی ترقی اور نت نئے طبی تجربات نے انسانی زندگی کے مختلف گوشوں میں متعدد پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے ہیں جن کا شرعی حل نکالنا اور امت کی صحیح رہنمائی کرنا اہلِ فقہ وفتاویٰ کی اہم ذمہ داری ہے۔اس تحریر میں بعض طبی مسائل پر شرعی نقطۂ نظر سے گفتگو کرنا مقصود ہے۔ذیل میں ان مسائل کو ہم قدرے وضاحت کے ساتھ پیش کر رہے ہیں:

نفخِ روح سے مراد کیا ہے؟

آج کل فقہ وفتاویٰ سے تعلق رکھنے والے علماء کے سامنے یہ سوال یکے بعد دیگرے آتا رہتا ہے کہ انسانی جسم میں جو روح ڈالی جاتی ہے، جسے شرعی اصطلاح میں نفخِ روح کہا جاتا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ جدید طبی تحقیق میں جنین میں ظاہر ہونے والی دھڑکن ہی کو نفخ روح کی علامت سمجھا جاتا ہے؟ جب کہ فقہاء کے مشہور قول میں نفخ روح کی مدت چار ماہ یعنی ۱۲۰ دن متعین ہے، یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورت میں شرعی عذر کی بناء پر اسقاط حمل کی گنجائش کس مدت تک رہے گی؟ چار مہینے تک یا اس سے پہلے بھی عدم جواز کا حکم ہو سکتا ہے؟

اس سوال کے جواب سے قبل ہمارے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ اللہ تعالی نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا اور اس کی تخلیق کو مختلف مراحل سے گزارا، ان مراحل میں سب سے اہم مرحلہ نفخ روح ہے، یعنی وہ وقت جب اللہ تعالی جنین میں روح داخل فرماتا ہے، یہ مرحلہ نہ صرف انسانی زندگی کا آغاز حقیقی ہے بلکہ اس سے متعدد شرعی احکام بھی وابستہ ہیں، خصوصا اسقاط حمل، وراثت، نماز جنازہ اور دیگر فقہی مسائل میں اس کی بڑی اہمیت ہے۔

نفخ کے معنی ہیں پھونکنا اور روح سے مراد وہ لطیف مخلوق ہے جس کے ذریعے انسان زندہ رہتا ہے، اس طرح نفخ روح کے لغوی معنی روح کو پھونکنا یا روح کو جسم میں داخل کرنا ہے، شرعی اصطلاح میں نفخ روح سے مراد وہ مرحلہ ہے جب اللہ تعالی اپنے حکم سے رحم مادر میں موجود جنین میں روح داخل فرماتا ہے۔ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ﴾ [السجدة:9]

روح کی حقیقت کیا ہے:

یہ دراصل انسان کی عقل سے ماوراہے اوراس کا مکمل علم صرف اللہ تعالی کو ہے۔ارشاد خداوندی ہے:

﴿وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الرُّوحِ قُلِ الرُّوحُ مِنْ أَمْرِ رَبِّي وَمَا أُوتِيتُمْ مِنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا﴾ (الاسراء:85)

قرآن کی روشنی میں تخلیق انسانی پر تحقیق کرنے والے ایک بڑے اسکالر الدکتور محمد علی البار علامہ ابن قیم کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

الروح أمرٌ مجهولٌ، لا نقول فيه إلا إنه من أمر ربي، وما أوتي من العلم إلا قليلاً، ولكن الله سبحانه وتعالى قد أخبرنا أنه كرّم آدم بنفخ الروح فيه، كذلك كرّم نبيه آدم، حيث جعل نسله من سلالة من ماء مهين، ثم سوّاه ونفخ فيه من روحه، حيث جعل له: (خلق الإنسان بين الطب والقرآن، ۳۵۲، ط: الدار السعودية للنشر والتوزيع)

قرآن مجید کی صراحت اور علامہ ابن قیم کی وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ روح کی حقیقت انسانی علم سے باہر ہے،لیکن احادیث نبویہ میں نفخ روح کے بارے میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ملتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إن أحدكم يُجْمَع خلقه في بطن أُمه أربعين يومًا نُطفةً، ثم يكون علقةً مثل ذلك، ثم يكون مُضْغَةً مثل ذلك، ثم يُرسل إليه الملك فينفخ فيه الروح (بخاری ۳۲۰۸، ومسلم ۲۶۴۳)

اس حدیث پاک میں واضح طور پر یہ بتلایا گیا ہے کہ 120 دن کے بعد نطفے میں روح پڑتی ہے، جبکہ ابتدا میں 40 دن تک نطفے کی شکل میں پھر 40 دن تک خون کے لتھڑے کی شکل میں اوراس کے بعد 40 دن تک گوشت کے ٹکڑے کی شکلوں میں ہوتا ہے پھر اس کے بعد روح پڑتی ہے،لہذا نفخ روح سے متعلق اس حدیث میں پوری طرح صراحت موجود ہے اور فقہاء کرام نے شدید ضرورت کے وقت چار ماہ سے قبل اسقاط کی گنجائش کی صراحت کی ہے،لہذا صریح نص کی موجودگی میں کسی جدید طبی تحقیق کا اعتبار نہیں ہوگا بلکہ نص ہی کو حکم شرعی کی بنیاد قرار دیا جائے گا، نیز اگر دیکھا جائے تو کائنات کی تقریبا ہر چیز میں ہی اپنی نوع کی حیات ہے،اسی طرح نطفے میں بھی آثار حیات ہوتے ہیں،اسی لیے دل کی دھڑکن یا دماغی سرگرمی کو نفخ روح قرار نہیں دیا جاسکتا، کیونکہ نفخ روح ایک غیبی امر ہے جس کا مدار وحی پر ہے نہ کہ صرف طبی مشاہدات پر۔

اسقاط حمل کے لئے عذر شرعی کا معیار:

یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اسقاط کے لئے عذر شرعی کا معیار کیا ہے؟ کیا کثرت اولاد، ان کی نگہداشت میں دشواری، شوہر کے حقوق کی ادائیگی میں خلل یا ملازمت پیشہ خواتین کے لئے قانونی دشواری کو شرعی عذر مانا جاسکتا ہے؟

اس معاملہ میں شریعت اسلامی کی ہدایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی جان کی حفاظت کو اسلامی شریعت کے مقاصد شرع میں بنیادی حیثیت دی گئی ہے، اس لیے حمل قرار پانے کے بعد جنین کی جان بھی قابل احترام ہے اور بلا ضرورت اسقاط حمل کی اجازت نہیں دی گئی ہے، البتہ اگر کوئی ایسی حقیقی اور یقینی یا غالب گمان پر مبنی ضرورت پیش آجائے جس کے نہ ہونے سے ماں کی جان یا اس کی صحت کو شدید خطرہ لاحق ہو تو فقہاء کرام نے ضرورت کے اصول کے تحت محدود گنجائش بیان کی ہے، اس بنا پر اسقاط حمل کے لیے شرعی عذر کا معیار محض ذاتی سہولت یا معاشرتی مشکلات نہیں بلکہ ایسی ضرورت ہے جسے شریعت معتبر سمجھتی ہے اور اس کی تصدیق ماہر اور قابل اعتماد ڈاکٹر کے ذریعہ ہوتی ہو۔

صرف زیادہ اولاد ہونا یا آئندہ بچوں کے اخراجات اور ان کی نگہداشت میں دشواری کا خوف شرعی عذر نہیں بن سکتا، قرآن کریم نے رزق کے اندیشے سے اولاد کو ختم کرنے سے منع کیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ إِمْلَاقٍ نَّحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَإِيَّاكُمْ إِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْأً كَبِيراً (الاسراء: 31)

لہذا معاشی تنگی یا کثرت اولاد کی وجہ سے اسقاط حمل کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔

علامہ ابن عابدینؒ نے اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ (ردالمحتار، ج: ۲/ ص: ۲۳۸، دارالفکر بیروت، ۱۳۸۷ھ)

اسی طرح ماں کی زندگی خطرہ میں ہو اور موت موہوم ہو، غالب گمان نہ ہو، تو اسقاط جائز نہیں ہے، علامہ ابن عابدین فرماتے ہیں:

ولو كان حيا لا يجوز تقطيعه لان موت الام به موهوم فلا يجوز قتل آدمي حي لامر موهوم۔

(ردالمحتار، ج ۲، ص: ۲۳۸)

اور یہ کہنا کہ حمل کی وجہ سے شوہر کے حقوق متاثر ہوں گے بذات خود شرعی عذر نہیں ہے، ازدواجی زندگی میں عارضی دشواریاں ایک فطری امر ہیں لیکن ان کی بنیاد پر جنین کی جان کو ختم کرنا عقل و شریعت کے خلاف ہے اور ملازمت و ترقی میں رکاوٹ، ملازمت ختم ہونے کا اندیشہ یا قانونی پیچیدگیاں بھی شرعی عذر نہیں بن سکتیں، کیونکہ اسقاط حمل کے جواز کا معیار معتبر شرعی ضرورت ہے نہ کہ سہولت یا معاشرتی و معاشی مشکلات، اس لیے کثرت اولاد، بچوں کی نگہداشت کی دشواری، شوہر کے حقوق کی ادائیگی میں خلل یا ملازمت پیشہ خواتین کو پیش آنے والی قانونی یا ملازمتی مشکلات عام حالات میں شرعی عذر شمار نہیں ہوتیں، اسقاط حمل کی اجازت صرف ایسی حقیقی اضطراری صورت میں دی جاسکتی ہے جس میں ماں کی جان یا اس کی صحت کو شدید خطرہ ہو اور اس کی بنیاد معتبر طبی تشخیص اور اہل علم کی شرعی رہنمائی پر ہو۔

چار ماہ گذرنے کے بعد جنین میں نقص پائے جانے پر اسقاط کا حکم:

جمہور فقہائے امت کے نزدیک نفخ روح (120 دن) کے بعد جنین میں مکمل انسانی جان کا حکم رکھتا ہے، اسی بنا پر اس مرحلے کے اسقاط حمل اصلاً حرام ہے، خواہ طبی معائنہ یا الٹراساؤنڈ کے ذریعے یہ معلوم ہو کہ جنین شدید پیدائشی نقص کا شکار ہے، جیسے دماغ ناقص ہے یا گردے موجود نہیں ہیں یا ناکارہ ہیں، وہ ناقابل علاج جسمانی عیب میں مبتلا ہے، جڑواں بچوں کے اعضاء آپس میں جڑے ہوئے ہیں یا حمل زنا کا نتیجہ ہے جس سے معاشرتی بدنامی یا قانونی سزا کا اندیشہ ہو، ان میں سے کوئی بھی سبب چار ماہ کے بعد اسقاط حمل کے جواز کے لیے کافی نہیں ہے کیونکہ طبی تشخیص ظنی ہوتی ہے اور جنین کی جان کا احترام ان تمام اعتبارات پر مقدم ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ [الإسراء:33]

اسی طرح حمل زنا کے بارے میں معاصر فقہی تحقیقات میں بھی یہی اصول اختیار کیا گیا ہے کہ زنا کے نتیجہ میں ٹھہرنے والا حمل بھی اپنی ذات میں محترم ہے، اس لیے نفخ روح کے بعد محض زنا، سماجی بدنامی یا قانونی سزا کے اندیشے کی بنا پر اسقاط جائز نہیں، البتہ اگر ایسی عورت شرعی طور پر حد کی مستحق ثابت نہ ہوئی ہو یا وہ جبر و اکراہ کا شکار ہو تو ضرورت کے باب میں اس کے ساتھ بھی وہی احکام جاری ہوں گے جو دیگر حاملہ عورتوں کے ہیں اور ضرورت یا حاجت کی بنا پر دی گئی رخصت صرف اسی قدر ہوگی جس قدر ضرورت کا تقاضا ہو، اس حکم کی بنیاد شریعت کے اس اصول پر ہے کہ ہر شخص اپنے ہی عمل کا ذمہ دار ہے دوسرے کو اس کے جرم کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ [الإسراء:15]

کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

ماہر تجربہ کار ڈاکٹروں کی رائے شرع کی نظر میں:

البتہ اگر ماہر تجربہ کار دیانتدار اور قابل اعتماد مسلمان ڈاکٹروں کی ایک کمیٹی اس امر کی تصدیق کرے کہ چار مہینے کے بعد کے حمل کی نوعیت اس طرح ہو کہ حمل برقرار رکھنے اور ولادت کی صورت میں ماں کی جان کو یقینی یا غالب گمان کے درجے میں شدید خطرہ لاحق ہے اور اسقاط حمل کے علاوہ ماں کی جان بچانے کا کوئی دوسرا ذریعہ موجود نہیں تو ایسی اضطراری حالت میں فقہاء نے فقہی قاعدہ:

إذا تعارض مفسدتان رُوعي أعظمُهما ضررًا بارتكاب أخفهما۔

جب دو مفسدے باہم متعارض ہوں تو بڑے مفسدے سے بچنے کے لیے چھوٹا مفسدہ اختیار کیا جاتا ہے۔

کی بنیاد پر اسقاط حمل کی اجازت دی ہے تاکہ ماں کی محقق جان کو بچایا جا سکے۔

(الأشباه والنظائر لابن نجيم، ص 76، دار الكتب العلمية بيروت ۱۹۹۹ء)

اسی اصول کو مجمع الفقہ الاسلامی لرابطہ العالم الاسلامی کے بارہویں نشست میں اختیار کرتے ہوئے یہ قرارداد

منظور کی گئی ہے۔(قرار المجمع الفقہ الاسلامی لرابطۃ العالم الاسلامی فی دورۃ الثانیۃ عشرۃ المنعقدۃ بمکۃ المکرمۃ)

محض حاملہ کی خواہش پر اسقاط اور ڈاکٹر کی ذمہ داری:

اسقاط حمل کے مسئلے میں صرف حاملہ عورت کی خواہش یا درخواست فیصلہ کن نہیں ہوتی بلکہ معالج پر بھی یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اسقاط کے سبب کی تحقیق کرے اور یہ اطمینان حاصل کرے کہ پیش کیا جانے والا عذر شریعت کی نظر میں معتبر ہے یا نہیں، لہٰذا ڈاکٹر کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ ہر آنے والی حاملہ عورت (خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم) کے مطالبہ پر بلا تحقیق اسقاط حمل کر دے یا دوا فراہم کر دے، کیونکہ بلا عذر شرعی اسقاط حرام ہے اور حرام اسقاط میں تعاون کرنا گناہ میں تعاون کرنے کے حکم میں داخل ہوگا۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدۃ: ۲)

گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

اسی لیے اگر اسقاط کی وجہ شرعاً معتبر نہ ہو، مثلاً محض معاشی تنگی، سماجی بدنامی، حمل زنا کو چھپانا یا ذاتی سہولت ہو تو ڈاکٹر کے لیے اسقاط کرنا یا اس کی دوا دینا جائز نہیں، البتہ اگر معتبر شرعی عذر موجود ہو اور فقہاء کی بیان کردہ شرائط پوری ہوں تو اس صورت میں اسقاط کی اجازت ہوگی ورنہ وہ گناہ کے کام میں تعاون کرنے والا شمار ہوگا۔

اس مسئلہ میں فقہ اکیڈمی کے آٹھویں سمینار بمقام مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۹۵ء کی تجویز نمبر ۵ میں یہ فیصلہ موجود ہے:

> طبیب کو چاہئے کہ بغیر کسی ناگزیر وجہ کے نہ اسقاط حمل کرے نہ کوئی ایسی دوا دے جس سے جنین ساقط ہو جائے، اور نہ دوا یا عمل جراحی کے ذریعہ بانجھ پن پیدا کرے، وہ ڈاکٹر جو سرکاری ملازم ہے اور ان کو ایسا کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے وہ معذور ہیں، لیکن اگر طبیب کی رائے میں عورت کی صحت کو شدید ضرر لاحق ہو تو حمل میں جان آنے سے پہلے یعنی ۱۲۰ دنوں کے اندر حمل ضائع کیا جا سکتا ہے۔

جب حمل پر 120 دن یعنی چار ماہ گزر جائیں تو نص قرآنی اور احادیث نبویہ کے پیش نظر جمہور فقہاء کے نزدیک جنین میں روح پھونک دی جاتی ہے، جس کے بعد وہ مستقل انسانی جان کا درجہ حاصل کر لیتا ہے، اس بنا پر اس مرحلے کے بعد اسقاط حمل کا حکم محض ایک طبی عمل کا نہیں رہتا بلکہ محترم انسانی جان کے تحفظ کا مسئلہ بن جاتا ہے شریعت اسلامیہ نے انسانی جان کے احترام کو بنیادی مقصد قرار دیا ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ [الإسراء: 33]

مدت حمل کی تعیین میں حاملہ یا اہل خانہ کے بیان کی حیثیت:

اسقاط حمل کے شرعی احکام میں حمل کی مدت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کیونکہ فقہائے کرام کے نزدیک حمل کے 120 دن مکمل ہونے کے بعد جنین میں روح پھونک دی جاتی ہے، جس کے بعد اسقاط حمل کے احکام پہلے مرحلے سے

یکسر مختلف ہو جاتے ہیں، اسی لیے حمل کی مدت کا صحیح تعین نہایت اہم ہے کیونکہ معمولی غلطی بھی ایک محترم جان کے ضائع ہونے کا سبب بن سکتی ہے۔

اس بنا پر محض حاملہ عورت یا اس کے اہل خانہ کے بیان پر اعتماد کرنا کافی نہیں خصوصا جب اسقاط حمل کا شرعی حکم اسی مدت پر موقوف ہو، اگرچہ اصول یہ ہے کہ مسلمان کا قول معتبر ہوتا ہے لیکن جب معاملہ انسانی جان سے متعلق ہو اور اس کے صحیح تعین کے لیے معتبر طبی ذرائع موجود ہوں تو ڈاکٹر پر لازم ہے کہ وہ خود مناسب طبی تحقیق کرے اور حمل کی مدت کا تعین محض دعوے کے بجائے خود بھی شواہد کی بنیاد پر کریں شریعت نے ہر ایسے معاملے میں تحقیق اور احتیاط کا حکم دیا ہے جس کا تعلق جان کے تحفظ سے ہو۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (الاسراء: 36)

اور جس بات کی تم کو خبر نہ ہو اس کے پیچھے نہ پڑو۔

اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

أيُما طبيبٍ تَطبَبَ على قَومٍ لا يُعرَفُ لهُ تَطَبُبٌ قبلَ ذلك فأعْنَتَ فهوَ ضامِنٌ (أبو داؤد: 4587، والنسائي: 4830)

اس حدیث سے فقہا نے یہ اصول اخذ کیا ہے کہ طبیب پر لازم ہے کہ وہ ہر طبی فیصلہ علم، مہارت اور تحقیق کی بنیاد پر کرے۔

موسوعہ فقہیہ کویتیہ میں یہ درج ہے کہ فقہاء مالکیہ نے صراحت کی ہے کہ اگر طبیب ناواقف ہو اور عمل طب میں غلطی کر جائے تو اس کی سزا ہوگی اور قید بھی ہوگی، اسی طرح فقہاء احناف کہتے ہیں کہ جاہل طبیب پر حجر کا حکم ہوگا اور اسے مسلوب الاختیار قرار دیا جائے گا۔ (موسوعۃ الفقہیۃ: ۳۰۰/۱۶)

موسوعہ فقہیہ میں یہ بھی مذکور ہے کہ طبیب جب علاج میں کوتاہی یا غلطی کرے تو بالاتفاق فقہاء طبیب ضامن ہوگا۔

يَضْمَنُ الطَّبِيبُ إِذَا عَالَجَ الْمَرِيضَ فَقَصَّرَ فِي مُعَالَجَتِهِ، أَوْ أَخْطَأَ فِيهَا خَطَأً فَاحِشًا، وَهَذَا مَحَلُ اتِّفَاقٍ بَيْنَ الْفُقَهَاءِ (موسوعة الفقهية: ۱۳/ ۱۵۱)

لہذا اسقاط حمل جیسے حساس معاملے میں جہاں حمل کی مدت ہی حکم شرعی کی بنیاد ہے ڈاکٹر کے لیے محض عورت یا اس کے اہل خانہ کے بیان پر اعتماد کرنا کافی نہیں ہے بلکہ اس پر لازم ہے کہ طبی معائنہ، حمل کی تاریخ، الٹراساؤنڈ اور دیگر معتبر ذرائع سے حمل کی عمر کی تحقیق کرے تاکہ فیصلہ یقین اور غالب گمان کی بنیاد پر ہو، یہی طبی احتیاط شرعی امانت اور پیشہ وارانہ ذمہ داری کا تقاضا ہے۔ ڈاکٹر اگر اس معاملہ میں کوتاہی سے کام لے یا غلطی کرے تو وہ اس کا ذمہ دار ہوگا اور یہ قابل مؤاخذہ عمل ہوگا۔

اسلامی شریعت نے انسانی جسم کو اللہ تعالی کی امانت قرار دیا ہے اور بلا ضرورت کسی عضو کو تلف کرنے یا مستقل طور پر ختم کرنے کی اجازت نہیں دی، رحم (بچہ دانی) عورت کے بنیادی اعضائے تولید میں سے ہے لہذا اسے محض سہولت،

ازالۂ مشقت یا آئندہ حمل سے بچنے کی غرض سے نکالنا اصل حکم کے اعتبار سے ناجائز ہے، الا یہ کہ ایسی حقیقی طبی ضرورت موجود ہو جس کا کوئی دوسرا متبادل علاج نہ ہو۔

ذہنی توازن سے محروم اور بے شعور عورت کی بچہ دانی نکالنے کا شرعی حکم:

اگر کوئی عورت ذہنی توازن سے محروم (مجنونہ) ہو اسے حیض ونفاس کا شعور نہ ہو اور وہ اپنی صفائی کا خیال نہ رکھ سکتی ہو یا بار بار کپڑے آلودہ کر دیتی ہو یا لوگوں کے سامنے ستر کھول دیتی ہو جس سے گھر والوں کو شدید مشقت پیش آتی ہو تو یہ صورت بلاشبہ دشوار ہے لیکن، محض اس مشقت یا معاشرتی شرمندگی کی بنا پر بچہ دانی نکالنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، کیونکہ مشقت کا ازالہ ایسے طریقے سے نہیں کیا جاسکتا جس میں مستقل جسمانی نقصان اور تولیدی صلاحیت کا خاتمہ لازم آتا ہو۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

وَلا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ [البقرة:195] اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔

صحیح بخاری کی شرح عمدۃ القاری میں باب مایکرہ من التبتل والخصاء کے ذیل میں ذکر کیا ہے کہ:

فان الاختصاء فی الآدمی حرام مطلقا۔(عمدة القاری شرح البخاری :کتاب النکاح : ۲۰/۱۰۲، دار الکتب العلمیة، بیروت، ۲۰۰۱ء)

اس لیے محض اس عذر کی وجہ سے اس کی ماہواری ختم کرنے کے لیے آپریشن کروا کر اسے بچوں کی پیدائش کی صلاحیت سے محروم کر دینا شرعا درست نہیں ہے، البتہ اگر اطباء کی رائے کے مطابق ماہواری روکنے کے لیے کسی دوا کا استعمال مضر صحت اور باعث تکلیف نہ ہو تو ایسی صورت میں ماہواری روکنے کے لیے کسی دوا اور تدبیر کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ شیخ وہبہ الزحیلی نے ذکر کیا ہے:

وبناء علیه یجوز استعمال موانع الحمل الحدیثیة کالحبوب وغیرها لفترة مؤقتة، دون أن یترتب علیه استئصال امکان الحمل وصلاحیة الانجاب، قال الزرکشی: یجوز استعمال الدواء لمنع الحبل فی وقت دون وقت کالعزل، ولایجوز التداوی لمنع الحبل بالکلیة(الفقه الاسلامی وادلته: ۳/۵۵۵، دار الفکر، دمشق، الطبعة الثانی ۱۹۸۵ء)

ان فقہی آراء کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ اگر حیض کی صفائی، تیمارداری یا نگرانی کا مسئلہ دیگر ذرائع سے حل کیا جا سکتا ہو تو رحم نکالنے کی اجازت نہیں ہوگی، کیونکہ مستقل جسمانی نقصان اختیار کرنا شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔

البتہ اگر مستند اور ماہر امراض نسواں کے ڈاکٹروں کی ایک کمیٹی اس بات پر متفق ہو کہ بچہ دانی میں ایسا خطرناک مرض موجود ہے مثلا: سرطان (CANCER)، مسلسل جان لیوا خون بہنا یا کوئی ایسی بیماری جس سے عورت کی جان یا صحت کو شدید نقصان اور یقینی خطرہ لاحق ہو اور رحم نکالنے کے علاوہ علاج کا کوئی مؤثر متبادل موجود نہ ہو تو ایسی صورت میں

طبی ضرورت کی بنا پر رحم نکالنے کی اجازت ہوگی، کیونکہ اس کا مقصد سہولت نہیں بلکہ جان کا تحفظ ہوگا اور شریعت نے ممکن حد تک تحفظ جان کی ہدایت دی ہے۔

ایک مسلمان مرد کے لئے امراض نسواں کا ماہر (Gynecologist) بننا:

ایک یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ تولید اور اس سے متعلق چیزوں کی مشق کے لئے سیکھنے والوں کو یقینی طور پر اجنبیہ عورت کے واجب الستر حصوں کو دیکھنے اور چھونے کی نوبت آتی ہے، تو کیا کسی مسلمان مرد کے لئے امراض نسواں کا علم حاصل کرنا اور اس کا ماہر (Gynecologist) بننا شرعاً درست ہے؟ اس سلسلہ میں اسلام نے مرد وعورت دونوں پہ عزت، حیا اور ستر کی حفاظت کو بنیادی شرعی مقاصد میں شمار کیا ہے، اسی لیے بلا ضرورت اجنبی عورت کے ستر کو دیکھنا یا چھونا حرام قرار دیا گیا ہے، امراض نسواں کی تعلیم اور عملی تربیت کے دوران چونکہ اجنبی خواتین کے واجب الستر اعضاء کو دیکھنا اور ان کا معائنہ کرنا ناگزیر ہوتا ہے، اس لیے اس کا حکم بھی شرعی اصولوں کی روشنی میں معین ہوگا، اصل اصول یہ ہے کہ اجنبی عورت کے ستر کو دیکھنا یا بلا ضرورت اس کو چھونا جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالی کا ارشاد ہے:

قُل لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوا فُرُوجَهُمْ (النور: ۳۰)

آپ ایمان والے مردوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نظریں نیچی رکھیں، اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں۔

اسی طرح عورتوں کو بھی یہی حکم دیا گیا ہے۔

حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

لأن يطعن في رأس أحدكم بمخيط من حديد خير له من أن يمس امرأة لا تحل له (رواه الطبرانی والبيهقی)

فقہاء نے بھی تصریح کی ہے کہ اصل حکم یہی ہے کہ علاج کے علاوہ کسی مقصد سے اجنبی عورت کو دیکھنا یا چھونا جائز نہیں علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں:

مَطْلَبُ الْمَوَاضِعُ الَّتِي يَحِلُّ فِيهَا النَّظَرُ إلَى عَوْرَةِ الْأَجْنَبِيِّ (قَوْلُهُ لِإِبَاحَتِهِ لِتَحَمُّلِ الشَّهَادَةِ) وَمِثْلُهُ نَظَرُ الْقَابِلَةِ وَالْخَافِضَةِ وَالْخَتَّانِ وَالطَّبِيبِ (رد المحتار 36/4، دار الفكر، بيروت، ۱۹۶۶ء)

فقہائے کرام نے واضح کیا ہے کہ اصل حکم حرمت ہے، البتہ ضرورت کے وقت اس میں رخصت دی جاتی ہے۔ علامہ ابن نجیم نے الاشباہ والنظائر میں ایک قاعدہ بیان کیا ہے:

الضرورات تبيح المحظورات (الأشباه والنظائر لابن نجيم: ص ۷۳، ناشر: دار الكتب العلمية بيروت ۱۹۹۹ء)

ضرورتیں ممنوعات کو جائز کر دیتی ہیں۔

لیکن اسی کے ساتھ فقہا نے یہ قید بھی بیان کی ہے: الضرورۃ تقدر بقدرھا

اس لیے علاج کی ضرورت کے وقت اجنبی عورت کے جسم کو دیکھنے یا چھونے کی اجازت مطلق نہیں بلکہ اتنی ہی ہے جتنی علاج کے لیے ناگزیر ہو۔

خواتین کے لئے امراض نسواں یا دیگر شعبہ جات میں طب یا نرسنگ کی تعلیم حاصل کرنا:

خواتین کے لئے امراض نسواں ہوں یا دیگر امراض یا نرسنگ کی تعلیم حاصل کرنا اور مہارت پیدا کرنا اسلام میں ممنوع نہیں، لیکن سوال اس وقت ہوتا ہے جب کہ یہ تعلیم وتربیت مخلوط نظام تعلیم کے تحت ہو اس بارے میں اسلامی تعلیمات کا حاصل یہ ہے کہ اسلام نے علم نافع کے حصول کی ترغیب دی ہے اور ایسے علوم کو سیکھنا باعث اجر قرار دیا ہے جن سے انسانوں کی جان، صحت اور معاشرے کی ضروریات وابستہ ہوں، علم طب انہی علوم میں سے ایک ہے، بلکہ فقہائے کرام نے اسے ان علوم میں شمار کیا ہے جن کا سیکھنا فرض کفایہ ہے کیونکہ اس کے بغیر مسلمانوں کی جان وصحت کا تحفظ ممکن نہیں۔علامہ ابن عابدین نے رد المحتار کے مقدمے میں ذکر فرمایا ہے کہ:

قَالَ فِي تَبْيِينِ الْمَحَارِمِ: وَأَمَّا فَرْضُ الْكِفَايَةِ مِنْ الْعِلْمِ، فَهُوَ كُلُّ عِلْمٍ لَا يُسْتَغْنَى عَنْهُ فِي قِوَامِ أُمُورِ الدُّنْيَا كَالطِّبِّ وَالْحِسَابِ وَالنَّحْوِ وَاللُّغَةِ وَالْكَلَامِ(ردالمحتار : 1/42 ،دارالفکر بیروت ، ۱۳۸۶ء)

آج کے دور میں خواتین کے علاج، زچگی، امراض نسواں اور نرسنگ کے شعبوں میں مسلمان خواتین کی موجودگی ایک اہم دینی اور معاشرتی ضرورت ہے تاکہ خواتین کو غیر محرم مردوں کے سامنے اپنے ستر کو ظاہر کرنے کی ضرورت پیش نہ آئے، لیکن عصر حاضر میں اکثر میڈیکل کالج مخلوط نظام تعلیم کے تحت چل رہے ہیں، جبکہ خواتین کے لیے مخصوص میڈیکل کالج بہت کم ہیں تو ایسی مجبوری کی صورت میں مخلوط نظام میں شرعی حدود کے ساتھ تعلیم حاصل کرنا جائز ہوگا۔

مرد گائنا کولوجسٹ (Gynacologist) سے خواتین کا زچگی یا معائنہ کرانا کیسا ہے؟

عصر حاضر میں طب کے میدان میں ترقی کے باوجود یہ مسئلہ بکثرت پیش آتا ہے کہ کسی مقام پر خاتون گائنا کولوجسٹ تو موجود ہوتی ہے، لیکن یا تو اس کی فیس عام لوگوں کی استطاعت سے باہر ہوتی ہے، یا وہ تجربہ اور مہارت میں اس معیار کی نہیں ہوتی جو مریضہ کی حالت کا تقاضا ہو، جبکہ دوسری طرف ایک مرد گائنا کولوجسٹ زیادہ تجربہ کار، ماہر اور کم خرچ ہوتا ہے۔شرعی اعتبار سے کیا اس کی اجازت ہے کہ خواتین عورت گائنالوجسٹ کے بجائے مرد گائنالوجسٹ سے اپنا علاج کرائیں؟

اس سلسلہ میں فقہائے امت کا اس بات پر اتفاق ہے کہ عورت کے علاج میں اصل ترجیح خاتون معالج کو حاصل

ہے، کیونکہ اجنبی مرد کے لیے عورت کے ستر کو دیکھنا یا چھونا اصل کے اعتبار سے ممنوع ہے۔(سورۃ النور:30)

اسی طرح خواتین کو بھی نگاہیں نیچی رکھنے اور اپنی عصمت کی حفاظت کا حکم دیا گیا ہے۔(سورۃ النور:31)

اسی کے ساتھ فقہائے کرام نے علاج کے باب میں یہ اصول بھی قائم کیا ہے کہ علاج کے لیے حتی الامکان ہم جنس (Same Gender) معالج کو ترجیح دی جائے گی لیکن ضرورت کے وقت اس میں رخصت ہوگی۔علامہ ابن عابدین لکھتے ہیں:

مَطْلَبُ الْمَوَاضِعِ الَّتِي يَحِلُّ فِيهَا النَّظَرُ إلَى عَوْرَةِ الْأَجْنَبِيِّ (قَوْلُهُ لِإِبَاحَتِهِ لِتَحَمُّلِ الشَّهَادَةِ) وَمِثْلُهُ نَظَرُ الْقَابِلَةِ وَالْخَافِضَةِ وَالْخَتَّانِ وَالطَّبِيبِ وَزَادَ فِي الْخُلَاصَةِ: مِنْ مَوَاضِعِ حِلِّ النَّظَرِ لِلْعَوْرَةِ عِنْدَ الْحَاجَةِ الِاحْتِقَانُ وَالْبَكَارَةُ فِي الْعُنَّةِ وَالرَّدِّ بِالْعَيْبِ فَتْحٌ.(رد المحتار : ج؛۴/ ص ؛۳۶، ناشر: شركة مكتبة ومطبعةمصطفى البابى الحلبى وأولاده بمصر، وصوّرتها: دارالفكر، بيروت ۱۹۶۶ء)

اسی طرح علامہ ابن نجیم نے الأشباہ والنظائر میں ایک مشہور قاعدہ شرعی بیان کیا ہے:

الضرورات تبيح المحظورات۔(الأشباه والنظائر :ص ۷۳، ناشر : دار الكتب العلميه، بيروت ۱۹۹۹ء)

ضرورتیں ممنوعات کو جائز کر دیتی ہیں۔

مذکورہ قرآنی ہدایات، فقہاء کی تصریحات اور شرعی قاعدہ سے واضح ہوتا ہے کہ مرد ڈاکٹر سے علاج کا جواز اصل حکم نہیں بلکہ ضرورت یا حاجت پر مبنی استثناء ہے۔اور اسی کے ساتھ شریعت نے صرف پردے کا حکم نہیں دیا بلکہ علاج میں مہارت اور امانت کو بھی بنیادی حیثیت دی ہے۔رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

أَيُّمَا طَبِيبٍ تَطَبَّبَ عَلَى قَوْمٍ لَا يُعْرَفُ لَهُ تَطَبُّبٌ قَبْلَ ذٰلِكَ فَأَعْنَتَ فَهُوَ ضَامِنٌ (أبو داؤد:۴۵۸۷، والنسائي:۴۸۳۰)

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ شریعت کے نزدیک صرف علاج کرنا کافی نہیں بلکہ ماہر طبیب سے علاج مطلوب ہے۔اسی لیے فقہاء نے ناواقف طبیب کو علاج سے روکنے کی تصریح کی ہے۔(موسوعة الفقهية: جلد:۱۶، ص:۳۰۰)

امام کاسانی نے اسی طرح کی بات بدائع الصنائع میں لکھی ہے۔(بدائع الصنائع : ج:۷ ، ص ۱۶۹، مطبعة الجمالية بمصر)

یہ نصوص اس امر کی واضح دلیل ہیں کہ علاج میں مہارت (Expertise) خود ایک شرعی مطلوب شئی ہے، اور مریض کو غیر ماہر معالج کے سپرد کرنا شرعاً مطلوب نہیں۔

اگر موجود خاتون ڈاکٹر تجربہ اور مہارت میں اس معیار کی نہ ہو جو مریضہ کی حالت کا تقاضا ہو، اور ماہر ڈاکٹروں کی

رائے یا غالب گمان کے مطابق اس کی ناتجربہ کاری سے ماں یا بچے کی جان یا صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو، جبکہ مرد گائنا کولوجسٹ اس سے زیادہ ماہر ہو، تو اس صورت میں مرد ڈاکٹر سے رجوع کرنا شرعاً جائز ہوگا، کیونکہ یہاں دو مصلحتیں باہم متعارض ہیں: ایک ستر کی حفاظت، اور دوسری جان وصحت کا تحفظ۔

فقہاء نے اس مقام پر یہ اصول بیان کیا ہے:

إذا تعارضت مفسدتان روعي أعظمهما ضرراً بارتكاب أخفهما۔ (الأشباه والنظائر لابن نجيم :ص: ۷۶، بيروت ۱۹۹۹ء)

جب دو مفسدے باہم متعارض ہوں تو بڑے مفسدے سے بچنے کے لیے چھوٹا مفسدہ اختیار کیا جائے گا۔

لہذا اگر غیر ماہر خاتون ڈاکٹر کے علاج سے ماں یا بچے کی جان کو خطرہ ہو، تو محض اس لیے اس کو ترجیح دینا کہ وہ عورت ہے، شریعت کے مقصدِ حفظِ نفس کے خلاف ہوگا۔ اس لیے ایسی صورت میں زیادہ ماہر مرد ڈاکٹر سے علاج کرانا جائز بلکہ بعض اوقات ضروری ہوگا۔

اور دوسری بات اگر خاتون ڈاکٹر موجود ہو لیکن مہنگی ہو تو کیا مرد گائنا کولوجسٹ سے رجوع کیا جاسکتا ہے؟

اس مسئلے میں محض" خاتون ڈاکٹر موجود ہے" کہہ دینا کافی نہیں، بلکہ یہ بھی دیکھا جائے گا کہ آیا اس تک پہنچنا مریضہ کے لیے حقیقتاً ممکن ہے یا نہیں۔ فقہائے اسلام نے مالی استطاعت کو بہت سے شرعی احکام میں معتبر قرار دیا ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا۔ (البقرة: 286) (اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ مکلف نہیں بناتا)

مذکورہ آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت ایسے احکام کا مکلف نہیں بناتی جو انسان کی قدرت اور استطاعت سے باہر ہوں۔ تاہم اس اصول کا مطلب یہ نہیں کہ صرف اس وجہ سے کہ خاتون ڈاکٹر کی فیس مرد ڈاکٹر سے زیادہ ہے، اس لیے مرد ڈاکٹر سے رجوع جائز ہو جائے۔

اس بنا پر اگر خاتون ڈاکٹر کی فیس عام معمول سے زیادہ ہو لیکن مریضہ یا اس کے اہلِ خانہ اس کی ادائیگی کی استطاعت رکھتے ہوں، تو صرف کم خرچ ہونے کی وجہ سے مرد ڈاکٹر کو اختیار کرنا درست نہیں ہوگا، کیونکہ یہاں شرعی مصلحت (عورت کا عورت سے علاج) موجود ہے اور اس پر عمل ممکن بھی ہے۔ البتہ اگر خاتون ڈاکٹر کی فیس اتنی زیادہ ہو کہ اس کی ادائیگی مریضہ کے لیے شدید مالی تنگی، قرض یا غیر معمولی حرج کا سبب بنے، جبکہ مرد ڈاکٹر کم خرچ ہونے کے ساتھ ساتھ ماہر بھی ہو، تو ایسی صورت میں یہ مسئلہ حاجت کے درجے میں داخل ہو جاتا ہے۔ فقہاء نے واضح کیا ہے کہ ایسی حاجت جس میں شدید حرج پایا جائے، بعض اوقات ضرورت کے قائم مقام ہوتی ہے، اس لیے ایسے حالات میں مرد ڈاکٹر سے علاج کی گنجائش ہوگی، بشرطیکہ علاج کی تمام شرعی شرائط کی رعایت کی جائے۔

مندرجہ بالا دلائل کی روشنی میں راجح بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اصل حکم یہ ہے کہ زچگی اور امراضِ نسواں کے علاج میں خاتون ڈاکٹر ہی کو ترجیح دی جائے، کیونکہ یہی شریعت کے مقاصد اور فقہاء کی تصریحات کے مطابق ہے۔

لیکن اگر خاتون ڈاکٹر مطلوبہ مہارت نہ رکھتی ہو اور اس سے ماں یا بچے کی جان وصحت کو خطرہ لاحق ہونے کا اندیشہ ہو، تو زیادہ ماہر مرد گائنا کولوجسٹ سے علاج کرانا جائز بلکہ بعض اوقات واجب ہوگا، کیونکہ حفظِ نفس، حفظِ ستر پر مقدم ہے جب دونوں میں تعارض پیدا ہو۔

دوران حمل جنین کی صحت کی نگرانی کے لئے روٹین ٹسٹ کرنا؟

حمل کے دوران روٹین ٹیسٹ (الٹراساؤنڈ وغیرہ) کا آج کل عام رواج ہے، جس میں ناف کے نیچے کا حصہ کھولنا پڑتا ہے، کیا محض جنین کی صحت کی جانچ کے لئے (کسی شدید تکلیف کے بغیر) کسی مرد یا خاتون ڈاکٹر سے ایسے ٹیسٹ کروانا جائز ہے؟ نیز مرد یا خاتون ڈاکٹر کے لئے الٹراساؤنڈ کرنا جائز ہے؟ ستر غلیظ سے متعلق فقہی احکام کی روشنی میں اس صورت میں ضرورت کی حد اور اس کا معیار کیا ہوگا؟

عصر حاضر میں طب کے میدان میں ہونے والی ترقی نے حمل کی نگرانی کے متعدد ذرائع فراہم کیے ہیں، جن میں الٹراساؤنڈ (Ultrasound) کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حمل کے مختلف مراحل میں جنین کی عمر، نشوونما، دل کی دھڑکن، پیدائشی نقائص، رحم کی کیفیت، پانی کی مقدار اور زچگی سے متعلق ممکنہ خطرات معلوم کرنے کے لیے الٹراساؤنڈ اور بعض دیگر طبی معائنات معمول کا حصہ بن چکے ہیں۔ ان معائنوں کے دوران بعض اوقات ناف کے نیچے کا حصہ کھولنا پڑتا ہے اور کبھی داخلی (Transvaginal) معائنہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ اس بنا پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا محض جنین کی صحت کی نگرانی کے لیے، جبکہ حاملہ عورت کو کوئی شدید تکلیف بھی نہ ہو، ایسے معائنے شرعاً جائز ہیں؟ اور اگر جائز ہیں تو مرد یا خاتون ڈاکٹر کے لیے ان کی حدود کیا ہوں گی؟

اسلام نے انسانی جان، نسل اور صحت کے تحفظ کو مقاصدِ شریعت میں شامل کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ إِنَّ اللهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيمًا﴾ (النساء: 29)

اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو، بے شک اللہ تم پر نہایت مہربان ہے۔

نیز فرمایا: ﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾

اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔" (البقرۃ: 195)

دوسری طرف شریعت نے ستر کی حفاظت کا بھی حکم دیا ہے:

﴿قُلْ لِلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ﴾ ﴿وَقُلْ لِلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ﴾ (النور: 30-31)

لہٰذا اس مسئلے میں دو شرعی مقاصد جمع ہو جاتے ہیں: حفظ النفس (ماں اور بچے کی جان وصحت کا تحفظ) حفظ العرض والحیاء (ستر اور حیا کی حفاظت)

فقہاء نے علاج کو صرف بیماری تک محدود نہیں رکھا بلکہ بیماری سے پہلے اسبابِ حفاظت اختیار کرنے کو بھی مشروع قرار دیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تَدَاوَوْا عِبَادَ اللهِ، فَإِنَّ اللهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلَّا وَضَعَ مَعَهُ شِفَاءً۔ (سنن أبي داود، رقم: 3855، الترمذی: 2038)

لہٰذا اگر جدید طبی معائنہ کسی ممکنہ خطرے کو بروقت ظاہر کر کے ماں یا بچے کی جان بچانے کا ذریعہ بن سکتا ہو تو وہ علاج ہی کے حکم میں داخل ہوگا، محض فضول تجسس میں شمار نہیں ہوگا۔ لہٰذا روٹین ٹیسٹ (الٹرا ساؤنڈ) اگر طبی رہنما اصولوں کے مطابق حمل کی نگرانی اور ممکنہ خطرات کی بروقت تشخیص کے لیے کیا جا رہا ہو تو اصل کے اعتبار سے اس کی اجازت ہوگی، کیونکہ اس کا مقصد حفظِ نفس ہے۔

یہی اصول الٹرا ساؤنڈ پر بھی منطبق ہوگا۔

یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر حاملہ عورت کو کوئی تکلیف نہیں تو کیا صرف روٹین الٹرا ساؤنڈ بھی ''ضرورت'' میں شمار ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جدید طب میں بعض خطرناک بیماریاں ابتدائی مرحلے میں بغیر علامات کے ہوتی ہیں، مثلاً: Placenta previa, Ectopic complications, Congenital anomalies, Growth restriction, Oligohydramnios، ان کا بروقت علم نہ ہونے سے ماں اور بچے دونوں کی جان خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ لہٰذا اگر ماہر ڈاکٹر روٹین الٹرا ساؤنڈ کو طبی معیار (Standard Antenatal Care) کا حصہ قرار دے تو یہ حاجتِ معتبرہ میں داخل ہوگا، محض فضول معائنہ نہیں۔

قاعدہ شرعی ہے: الحاجة تنزل منزلة الضرورة عامة كانت أو خاصة. حاجت، خواہ عام ہو یا خاص، بعض احکام میں ضرورت کے قائم مقام ہوتی ہے۔'' (ابن نجیم، الأشباہ والنظائر: ص ۸۷، بیروت ۱۹۹۹ء)

لہٰذا شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ حمل کے دوران روٹین ٹیسٹ الٹرا ساؤنڈ اور دیگر ضروری طبی معائنات شرعاً جائز ہوں گے، کیونکہ ان کا مقصد جنین اور ماں کی صحت کی حفاظت اور ممکنہ خطرات کی بروقت تشخیص ہے، جو شریعت کے مقصد حفظ النفس کے مطابق ہے۔

پیدائشی طور پر مہلک امراض میں مبتلا بچوں کے ترک علاج کا حکم:

ایسے بچے جو پیدائشی طور پر مہلک امراض میں مبتلا ہوں اور طبی تحقیق کے مطابق ان کا زیادہ دنوں تک زندہ رہنا مشکل ہو، کیا والدین ان کا علاج اس نیت سے ترک کر سکتے ہیں کہ بچہ جلد فوت ہو جائے اور تکلیف سے بچ جائے؟ کیا

ڈاکٹر ایسا مشورہ دے سکتا ہے؟ یا اس مقصد سے کہ بچہ جلدی مرجائے قصداً علاج میں کمی کر سکتے ہیں؟ یا ایسی دوا وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں جس سے جلدی موت واقع ہو جائے؟

اسلام نے ہر انسانی جان کو، خواہ وہ صحت مند ہو یا بیمار، بالغ ہو یا نومولود، محترم قرار دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ﴾ (سورۃ الأنعام: 151)

اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے محترم قرار دیا ہے، مگر حق کے ساتھ۔

نیز فرمایا:

﴿مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيعًا﴾ (سورۃ المائدۃ: 32)

جس نے کسی بے گناہ شخص کو قتل کیا گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کر دیا۔

یہ آیات اس بات کی قطعی دلیل ہیں کہ کسی انسان کی جان لینا، خواہ وہ شدید بیمار ہی کیوں نہ ہو، شرعاً جائز نہیں، جب تک شریعت خود اس کی اجازت نہ دے۔

اسلام نے علاج کو مشروع قرار دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تَدَاوَوْا عِبَادَ اللَّهِ، فَإِنَّ اللَّهَ لَمْ يَضَعْ دَاءً إِلَّا وَضَعَ مَعَهُ شِفَاءً۔ (سنن أبي داود، رقم: 3855، الترمذی: 2038)

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل حکم علاج کی مشروعیت کا ہے، تاہم فقہاء نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ ہر بیماری میں علاج کا حکم ایک جیسا نہیں ہوتا؛ کبھی علاج واجب، کبھی مستحب، کبھی مباح اور بعض صورتوں میں علاج ترک کرنے کی بھی گنجائش ہو سکتی ہے، لیکن یہ سب اس وقت ہے جب مقصد قدرتی موت کا انتظار ہو، نہ کہ موت کو جلد لانا۔ اگر والدین یا ڈاکٹر اس نیت سے علاج چھوڑ دیں کہ بچہ جلد مرجائے، یا ایسی دوا دیں جس سے موت جلد واقع ہو، تو یہ شرعاً جائز نہیں، کیونکہ اس کا مقصد موت کو واقع کرنا ہے، اور یہ حقیقت میں قتل عمد کے مفہوم میں داخل ہوگا۔

لہٰذا بچے کی تکلیف ختم کرنے کے لیے اس کی زندگی ختم کرنا جائز نہیں، کیونکہ تکلیف کو قتل کے ذریعے دور نہیں کیا جا سکتا۔

اگر علاج سے صحت یابی یا زندگی میں حقیقی فائدے کی امید ہو تو علاج ترک کرنا، اس نیت سے کہ بچہ جلد فوت ہو جائے، جائز نہیں، کیونکہ یہ جان کے ضیاع کا سبب بنتا ہے۔ البتہ اگر معتبر اور ماہر ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچیں کہ مرض لاعلاج ہے، تمام مؤثر علاج ناکام ہو چکے ہیں، اور اب جاری علاج صرف موت کے عمل کو مصنوعی طور پر طول دے رہا ہے، جبکہ صحت یابی کی کوئی معقول امید باقی نہیں، تو ایسی صورت میں غیر مؤثر یا بے فائدہ علاج جاری نہ رکھنے کی فقہی گنجائش ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا مقصد موت لانا نہیں بلکہ بے فائدہ علاج کو ترک کرنا ہے۔ اس کے باوجود بچے کو خوراک، پانی، درد کم کرنے کی دوا اور بنیادی نگہداشت سے محروم کرنا جائز نہیں۔

والدین بچے کے مالک نہیں بلکہ اس کے امین ہیں، اس لیے انہیں بچے کی جان کے بارے میں ایسا فیصلہ

کرنے کا اختیار نہیں جو شریعت کے خلاف ہو۔اسی طرح ڈاکٹر کا فرض علاج اور مریض کی مصلحت کا تحفظ ہے، نہ کہ اس کی موت میں تعجیل کرنا۔اگر ڈاکٹر جان بوجھ کر علاج میں کوتاہی کرے یا ایسی دوا دے جس کا مقصد مریض کی موت جلد واقع کرنا ہو تو وہ شرعاً گناہ گار ہوگا اور اپنے فعل کا ذمہ دار ہوگا۔

مہنگے اور غیر امید افزا علاج کی صورت میں علاج بند کرنے یا مشین ہٹانے کا فیصلہ:

بسا اوقات یہ دیکھا جاتا ہے کہ علاج بہت مہنگا ہوتا ہے اور صحت کی امید بھی نہیں ہوتی ہے، ورثہ مالی تنگی یا تیمارداری کی مشقت کی وجہ سے بچنے کے لئے آئی سی یو (I-C-U) یا وینٹی لیٹر ہٹانا چاہتے ہیں کیا شریعت اسکی اجازت دیتی، اس میں شک نہیں کہ آج کل جدید طب نے ایسے بہت سے ذرائع ایجاد کیے ہیں جن کے ذریعے شدید بیمار مریض کی زندگی کو کچھ عرصہ تک برقرار رکھا جاسکتا ہے، مثلاً وینٹیلیٹر (Ventilator)، آئی سی یو (ICU)، ڈائیلاسس، قلبی معاون آلات (Cardiac Support) اور دیگر مصنوعی وسائل، لیکن بسا اوقات مریض ایسے مرحلے میں پہنچ جاتا ہے کہ ماہر ڈاکٹروں کے نزدیک صحت یابی کی امید تقریباً ختم ہو جاتی ہے، اور تمام علاج صرف زندگی کو مصنوعی طور پر برقرار رکھنے کا ذریعہ رہ جاتے ہیں۔

ایسے حالات میں علاج کے اخراجات بھی غیر معمولی ہوتے ہیں اور مریض کی تیمارداری بھی خاندان کے لیے سخت مشقت کا باعث بنتی ہے۔اس پس منظر میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ورثہ صرف مالی تنگی یا تیمارداری کی دشواری کی وجہ سے علاج بند کرنے، مریض کو آئی سی یو سے منتقل کرنے یا وینٹیلیٹر ہٹانے کا فیصلہ کر سکتے ہیں؟ یا اس فیصلے کا اختیار صرف ماہر ڈاکٹروں کو ہے؟

اسلام نے انسانی جان کو عظیم حرمت عطا کی ہے اور اس کی حفاظت کو شریعت کے بنیادی مقاصد میں شمار کیا ہے، جیسا کہ پہلے ذکر ہوا، اور اس بارے میں آیات وروات ذکر کی گئی ہیں۔

اگر علاج سے صحت یابی یا جان بچنے کی معقول امید موجود ہو تو صرف مہنگا ہونے یا ورثہ پر مالی بوجھ ہونے کی وجہ سے علاج بند کرنا جائز نہیں، کیونکہ انسانی جان کا تحفظ مال پر مقدم ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔(البقرۃ:195)

اس لیے اگر علاج مؤثر ہو تو ورثہ کو صرف اخراجات سے بچنے کے لیے اسے بند کرنے کا اختیار حاصل نہیں۔

اگر متعدد ماہر، دیانت دار اور تجربہ کار ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ دماغ یا جسم کے بنیادی افعال ناقابل واپسی طور پر ختم ہو چکے ہیں، علاج سے صحت یابی کی کوئی معقول امید باقی نہیں، وینٹیلیٹر یا آئی سی یو صرف موت کے عمل کو مصنوعی طور پر مؤخر کر رہے ہیں تو ایسی صورت میں بے فائدہ علاج (Futile Treatment) کو جاری رکھنا ہر حال میں لازم نہیں۔تاہم اس کا فیصلہ ورثہ اپنی خواہش یا مالی حالت کی بنیاد پر نہیں کریں گے، بلکہ معتبر طبی رائے کی بنیاد پر ہوگا۔

ورثہ مریض کے خیر خواہ ضرور ہیں، لیکن وہ اس کی جان کے مالک نہیں ہیں۔اس لیے: صرف تیمارداری کی مشقت، مالی اخراجات، یا ذہنی تھکن کی بنیاد پر وینٹیلیٹر ہٹانے یا علاج بند کرنے کا فیصلہ شرعاً درست نہیں۔اگر علاج کے بارے میں کوئی فیصلہ کیا جائے تو وہ معتبر طبی تشخیص کی بنیاد پر ہونا چاہیے، نہ کہ ورثہ کی سہولت کی بنیاد پر۔

جب معتبر ماہرین یہ طے کریں کہ وینٹیلیٹر اب علاج نہیں بلکہ صرف غیر مؤثر مصنوعی سہارا رہ گیا ہے۔اس کے باوجود مریض کو خوراک، پانی، صفائی، درد کم کرنے والی دوا اور بنیادی نگہداشت سے محروم کرنا جائز نہیں، کیونکہ یہ علاج نہیں بلکہ بنیادی انسانی حقوق ہیں۔

مریض نیم بے ہوشی کی حالت میں ہو اور اہل خانہ کا اس کی جائداد فروخت کر کے علاج کرانا:

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مریض بے ہوشی کی حالت میں ہوتا ہے اور فوری علاج کے لئے خطیر رقم کی ضرورت پڑتی ہے تو کیا اہل خانہ اس کی اجازت کے بغیر اس کی جائداد فروخت کر کے علاج کرا سکتے ہیں؟ یا اپنی رقم اس نیت سے علاج میں صرف کر سکتے ہیں کہ مریض کی شفایابی کے بعد یا وفات ہو جانے کی صورت میں اس کے ترکہ سے وصول کر لیں گے، بسا اوقات مریض شفایابی کے اس تصرف کو تسلیم نہ کرے تو شرعاً کیا حکم ہوگا؟

اس بارے میں شرعی حکم یہی ہے کہ عام حالات میں کسی شخص کے مال میں اس کی اجازت کے بغیر تصرف کرنا جائز نہیں، کیونکہ ملکیت ایک شرعی حق ہے جس کا احترام لازم ہے۔اسی طرح انسانی جان کی حفاظت بھی شریعت کا بنیادی مقصد ہے، یہاں تک کہ ضرورت کے مواقع پر بعض ممنوع امور کی بھی بقدرِ ضرورت اجازت دی گئی ہے تاکہ جان کو ضائع ہونے سے بچایا جا سکے۔عصر حاضر میں جدید طبی سہولیات اور مہنگے علاج کے رواج نے اس مسئلے کو مزید پیچیدہ بنا دیا ہے۔بعض اوقات مریض ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ اپنے مالی معاملات کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں رہتا، جبکہ دوسری طرف فوری طبی مداخلت اور بھاری اخراجات ناگزیر ہوتے ہیں۔

لہذا مریض کی اہلیت (أهلية الأداء) اور اس کا شرعی اثر فقہ اسلامی میں تصرفات کی صحت کے لیے اہلیتِ ادا (أهلية الأداء) بنیادی شرط ہے۔اگر کوئی شخص بے ہوش، نیم بے ہوش یا ایسی حالت میں ہو کہ اپنے نفع و نقصان کو سمجھنے اور معتبر رضامندی دینے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو، تو اس کے مالی تصرفات نافذ نہیں ہوتے، اور نہ ہی اس کی طرف سے کوئی رضامندی معتبر سمجھی جاتی ہے۔لہذا نیم بے ہوشی کی حالت میں مریض کی خاموشی یا عدمِ اظہار کو اجازت نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ اس کے مفاد کی حفاظت کے لیے شریعت نے ولایت کے اصول مقرر کیے ہیں۔

اسلام میں کسی دوسرے کے مال میں بلا اجازت تصرف کرنا جائز نہیں۔اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (سورۃ النساء:29)

اے ایمان والو! ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِیبِ نَفْسٍ مِنْهُ۔ (أخرجہ أحمد: 23605)
(کسی مسلمان کا مال اس کی دلی رضامندی کے بغیر حلال نہیں)۔

اس بنا پر اصل اصول یہی ہے کہ مریض کی اجازت کے بغیر اس کی جائیداد فروخت کرنا، اس کا مال خرچ کرنا یا اس پر مالی ذمہ داری عائد کرنا جائز نہیں، البتہ اگر مریض کی جان فوری خطرے میں ہو، علاج میں تاخیر ہلاکت یا شدید نقصان کا سبب بن سکتی ہو، اور مریض اپنی اجازت دینے کی حالت میں نہ ہو، تو یہاں حفظِ نفس کا مقصد غالب آجاتا ہے۔

لہٰذا اگر علاج کے لیے فوری رقم کی ضرورت ہو اور کوئی دوسرا راستہ موجود نہ ہو تو مریض کے مفاد میں محدود اور ضروری تصرف کی گنجائش ہوگی، لیکن یہ اختیار مطلق نہیں ہوگا۔ صرف رشتہ دار یا وارث ہونے کی بنا پر کسی شخص کو مریض کے مال میں تصرف کا اختیار حاصل نہیں ہو جاتا، کیونکہ وارث کا حق مورث کی زندگی میں ثابت نہیں ہوتا۔ فقہاء کا اصول ہے: لا ترکة إلا بعد الموت. یعنی وراثت کا حق موت کے بعد ہی قائم ہوتا ہے۔ لہٰذا محض بیٹا، بھائی یا دیگر رشتہ دار اپنی طرف سے مریض کی جائیداد فروخت نہیں کر سکتے۔

ہاں اگر علاج فوری ضروری ہو، مریض اجازت دینے سے عاجز ہو، نقد رقم موجود نہ ہو، اور قانونی یا شرعی ولی کے ذریعے تصرف ممکن ہو، تو بقدرِ ضرورت مریض کے مفاد کے لیے تصرف کیا جا سکتا ہے، اور جہاں ممکن ہو عدالت یا مجاز اتھارٹی کی اجازت لینا زیادہ مناسب ہوگا، اور اگر مریض کی جان بچانے کے لیے قرض لینا ناگزیر ہو، تو اصل اختیار اس شخص کو ہوگا جو شرعاً یا قانوناً مریض کے مالی معاملات کا ذمہ دار ہو، عام اہلِ خانہ مریض کے ذمے قرض لازم نہیں کر سکتے، کیونکہ قرض ایک مستقل مالی ذمہ داری ہے، اور کسی شخص کو اس کی اجازت کے بغیر قرض کا پابند بنانا اصل اصول کے خلاف ہے، البتہ اگر معتبر ولایت حاصل ہو اور قرض لینا مریض کے مفاد کے لیے ناگزیر ہو، تو اس کی گنجائش ہوگی۔

اگر والدین، اولاد یا دیگر اہلِ خانہ اپنی ذاتی رقم مریض کے علاج پر خرچ کریں تو اس کی دو صورتیں ہیں

پہلی صورت: احسان اور تبرع: اگر خرچ کرنے کی نیت احسان، تعاون یا ہبہ کی ہو، تو بعد میں اس کی واپسی کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ ہبہ رجوع کے بغیر مکمل ہو جاتا ہے۔

دوسری صورت: قرض کی نیت: اگر ابتدا ہی سے نیت یہ ہو کہ یہ رقم بطورِ قرض دی جا رہی ہے، اور حالات بھی اس کی تائید کرتے ہوں، تو صحت یابی کے بعد مریض اس کا پابند ہوگا، اور اگر وہ وفات پا جائے تو یہ رقم اس کے ترکہ سے ادا کی جائے گی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے وراثت سے پہلے قرض کی ادائیگی کو مقدم رکھا ہے۔ ﴿مِن بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ﴾ وراثت کی تقسیم وصیت پوری کرنے اور قرض ادا کرنے کے بعد ہوگی۔ (سورۃ النساء: 11)

اگر اہلِ خانہ یہ ثابت کر دیں کہ علاج واقعی ضروری تھا، خرچ حقیقتاً اسی کے علاج پر ہوا، اور خرچ قرض کی نیت سے کیا گیا تھا، تو صرف مریض کے انکار سے ان کا حق ختم نہیں ہوگا، کیونکہ فقہ میں نیت اور حقیقت دونوں کا اعتبار کیا جاتا

ہے۔البتہ اگر قرض کی نیت ثابت نہ ہو، یا عرف اس خرچ کو خاندانی تعاون شمار کرتا ہو، تو ایسی صورت میں بعد میں مطالبہ محل نظر ہوگا، اور فیصلہ حالات وشواہد کے مطابق کیا جائے گا۔

راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ مریض کی اجازت کے بغیر اس کی جائیداد فروخت کرنا یا اس کے ذمے قرض لازم کرنا اصل کے اعتبار سے جائز نہیں، کیونکہ مال کی حرمت شریعت کا مسلم اصول ہے۔تاہم اگر مریض اجازت دینے سے عاجز ہو، علاج فوری ضروری ہو اور جان کو حقیقی خطرہ لاحق ہو، تو شرعی یا قانونی اختیار رکھنے والا شخص مریض کی مصلحت کے لیے بقدرِ ضرورت تصرف کرسکتا ہے۔صرف وارث ہونے کی بنا پر یہ اختیار حاصل نہیں ہوتا۔اسی طرح اگر اہلِ خانہ اپنی ذاتی رقم علاج پر خرچ کریں اور ابتدا ہی سے قرض کی نیت ہو تو صحت یابی کی صورت میں مریض اور وفات کی صورت میں اس کا ترکہ اس رقم کی ادائیگی کا ذمہ دار ہوگا، بشرطیکہ قرض کی نیت اور خرچ کا ثبوت موجود ہو۔

آپریشن سے متعدد بار ولادت ہونے کی صورت میں خواتین کا بچہ دانی نکلوانا:

خواتین کے مسائل میں ایک مسئلہ یہ بھی آتا ہے کہ اگر کسی خاتون کو آپریشن سے متعدد بار ولادت ہونے کی صورت میں عموما آئندہ مزید ولادت میں مشکلات پیش آتی ہیں، بلکہ بسا اوقات حمل ٹھہر جانا خطرہ کا سبب بن جاتا ہے کیا ایسی عورتیں بچہ دانی نکلوا کر سلسلہ تولید بالکلیہ منقطع کرسکتی ہیں، تاکہ آئندہ کے ممکنہ خطرات سے بچ سکیں؟ اس بارے میں کتاب وسنت اور فقہاء کی تصریحات بتاتی ہیں کہ انسان کی بقا کو شریعت کے بنیادی مقاصد میں شمار کیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے نکاح اور اولاد کو اپنی عظیم نعمت قرار دیتے ہوئے فرمایا: ﴿وَاللَّهُ جَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا وَجَعَلَ لَكُمْ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ بَنِينَ وَحَفَدَةً﴾ "اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں اور تمہیں ان سے اولاد اور پوتے پوتیاں عطا فرمائے۔" (سورۃ النحل:72)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تَزَوَّجُوا الْوَدُودَ الْوَلُودَ فَإِنِّي مُكَاثِرٌ بِكُمُ الْأُمَمَ (ایسی عورتوں سے نکاح کرو جو محبت کرنے والی اور زیادہ بچے جننے والی ہوں، کیونکہ میں تمہاری کثرت پر فخر کروں گا)۔(سنن أبي داود، حدیث: 2050، والنسائی:3227)

ان نصوص سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل حکم نسل کو باقی رکھنا ہے، اس لیے بلا ضرورت دائمی طور پر تولیدی صلاحیت ختم کرنا شریعت کے مزاج کے خلاف ہے۔فقہائے کرام نے بلا ضرورت انسان کی تولیدی صلاحیت کو مستقل طور پر ختم کرنے کو جائز قرار نہیں دیا، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق میں غیر ضروری تبدیلی اور مقصدِ نکاح ونسل کا فوت ہونا پایا جاتا ہے۔

علامہ بدرالدین عینی عمدۃ القاری میں لکھتے ہیں:

فان الاختصاء في الآدمي حرام مطلقا. (عمدة القاری شرح البخاری، 102/20)

اگرچہ رحم نکالنا خصی کرنے کے مترادف نہیں، لیکن دونوں میں دائمی طور پر تولید ختم ہو جاتی ہے، اس لیے اصل حکم

عدمِ جواز ہے، الا یہ کہ معتبر شرعی ضرورت موجود ہو۔

اگر متعدد آپریشنوں کے بعد ماہر اور دیانت دار ڈاکٹر اس نتیجے پر پہنچیں کہ آئندہ حمل کی صورت میں رحم پھٹنے، شدید خون بہنے یا ماں کی جان کو حقیقی خطرہ لاحق ہونے کا غالب گمان ہے، تو مسئلہ محض بقاءِ نسل کا نہیں رہتا بلکہ حفظِ نفس کا بن جاتا ہے، اور قرآنی آیات و روایات اور فقہی تصریحات سے اس کی اجازت ملتی ہے۔

اگر ایک طرف آئندہ حمل سے ماں کی جان کو شدید خطرہ ہو اور دوسری طرف رحم نکالنے سے تولید ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، تو یہاں دو مفسدے باہم متعارض ہیں۔ ایسی صورت میں اگر خطرہ واقعی ثابت ہو تو جان کا تحفظ نسل کے تحفظ پر مقدم ہوگا۔

صرف اس بنیاد پر کہ عورت کے دو، تین یا چار آپریشن ہو چکے ہیں، رحم نکالنا جائز نہیں ہوگا، کیونکہ بہت سی خواتین متعدد آپریشنوں کے بعد بھی محفوظ حمل اور ولادت کرتی ہیں۔ لہٰذا صرف احتمال یا اندیشے کی بنیاد پر مستقل ناقابل تولید کر دینا جائز نہیں، بلکہ درج ذیل شرائط ضروری ہیں: خطرہ حقیقی ہو، محض وہم نہ ہو۔ متعدد ماہر اور تجربہ کار گائناکولوجسٹ اس کی تصدیق کریں۔ متبادل ذرائع (مثلاً عارضی مانعِ حمل) مؤثر یا مناسب نہ ہوں۔ رحم نکالنا ہی جان بچانے کا آخری مؤثر ذریعہ ہو۔